۸ کافی

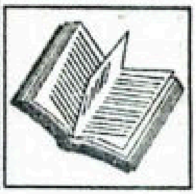

اس سبق کی تدریس کے بعد طلبہ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- نظم و نثر کو فہم کے ساتھ پڑھ کر مصنف/شاعر کی تکنیک، مقصد اور اسلوب پر مبنی سوالات کے جوابات دے سکیں۔
- ذرائع ابلاغ سے خبروں، ڈراموں اور فیچر میں اٹھائے گئے اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی نکات پر تنقیدی گفت گو سن کر اپنی رائے کا اضافہ کر سکیں۔
- منظوم اور منثور اصنافِ ادب پڑھ کر مصنفین کے طرزِ تحریر پر تبصرہ کر سکیں۔
- متن پڑھ کر خیالات، آرا اور رویوں کا آپس میں تعلق سمجھتے ہوئے اس پر تبصرہ اور تجزیہ کر سکیں۔
- علاماتِ اوقاف (استعجابیہ، استفہامیہ، تفصیلیہ، رابطہ، ترچھا خط، علامتِ شعر، علامتِ تخلص اور علامتِ مصرع) کو پہچان کر درست استعمال کر سکیں۔

خاص الفاظ					
	قُوّتِ شامہ	مَنطق	ذوق	ڈھنگارے	کھُرچن
	رَغبت	ثقافتی	اِستصوابِ رائے	عاقبت اندیشی	خلفیہ

ہدایات برائے اساتذہ کرام

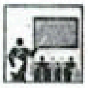

- طلبہ کو مشتاق احمد یوسفی کی مزاح نگاری کے بارے میں بتائیں اور انھیں مشتاق احمد یوسفی کی کوئی سی کتاب پڑھنے کا مشورہ دیں۔

پڑھنے سے پہلے پوچھیں

- کافی اور چائے میں کیا فرق ہے؟
- اپنے علاقے کے چند روایتی مشروبات کے نام بتائیں۔

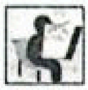

پڑھیں

میں نے سوال کیا: آپ کافی کیوں پیتے ہیں؟

انھوں نے جواب دیا: آپ کیوں نہیں پیتے؟

مجھے اس میں سگار کی سی بو آتی ہے۔

اگر آپ کا اشارہ اس کی سوندھی سوندھی خوشبو کی طرف ہے تو یہ آپ کی قوتِ شامہ کی کوتاہی ہے۔

گو کہ ان کا اشارہ صریحاً میری ناک کی طرف تھا۔ تاہم رفعِ شر کی خاطر، میں نے کہا: "تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیتا ہوں کہ کافی میں سے واقعی بھینی بھینی مہک آتی ہے۔ مگر یہ کہاں کی منطق ہے کہ جو چیز ناک کو پسند ہو وہ حلق میں انڈیل لی جائے۔ اگر ایسا ہی ہے تو کافی کا عطر کیوں نہ کشید کیا جائے تاکہ ادبی محفلوں میں ایک دوسرے کے لگایا کریں۔"

تڑپ کر بولے: صاحب! میں ماکولات میں معقولات کا دخل جائز نہیں سمجھتا تاوقتیکہ اس گھپلے کی اصل وجہ تلفظ کی مجبوری نہ ہو۔ کافی کی مہک سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک تربیت یافتہ ذوق کی ضرورت ہے۔ یہی سوندھا پن لگی ہوئی کھیر اور دھنگارے ہوئے رائتے میں ہوتا ہے۔ میں نے معذرت

کی: کُفر چن اور ڈھنگار دونوں سے مجھے متلی ہوتی ہے۔ فرمایا: ''تعجب ہے! یو۔پی میں تو شرفا بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔ میں نے اسی بنا پر ہندوستان چھوڑا۔ چراندے ہو کر کہنے لگے: آپ قائل ہو جاتے ہیں تو کج بحثی کرنے لگتے ہیں۔ جواباً عرض کیا: ''گرم ممالک میں بحث کا آغاز صحیح معنوں میں قائل ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ دانستہ دل آزاری ہمارے مشرب میں گناہ ہے۔ لہٰذا ہم اپنی اصل رائے کا اظہار صرف نشے اور غصے کے عالم میں کرتے ہیں۔'' خیر، یہ تو جملہ معترضہ تھا، لیکن اگر یہ سچ ہے کہ کافی خوش ذائقہ ہوتی ہے تو کسی بچے کو پلا کر اس کی صورت دیکھ لیجیے۔

جھلا کر بولے: آپ بحث میں معصوم بچوں کو کیوں گھسیٹتے ہیں؟

میں بھی الجھ گیا: آپ ہمیشہ بچوں سے پہلے لفظ معصوم کیوں لگاتے ہیں؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ کچھ بچے گناہ گار بھی ہوتے ہیں؟ خیر، آپ کو بچوں پر اعتراض ہے تو بلی کو لیجیے۔

بلی ہی کیوں؟ بکری کیوں نہیں؟ وہ سچ مچ مچلنے لگے۔

میں نے سمجھایا: بلی اس لیے کہ جہاں تک پینے کی چیزوں کا تعلق ہے، بچے اور بلیاں بُرے بھلے کی کہیں بہتر تمیز رکھتے ہیں۔

ارشاد ہوا: کل کو آپ یہ کہیں گے کہ چوں کہ بچوں اور بلیوں کو پکے گانے پسند نہیں آسکتے اس لیے وہ بھی لغو ہیں۔

میں نے انھیں یقین دلایا: میں ہر گز یہ نہیں کہہ سکتا۔ پکے راگ انھیں کی ایجاد ہیں۔ آپ نے بچوں کا رونا اور بلیوں کا لڑنا... بات کاٹ کر بولے: بہر حال ثقافتی مسائل کا فیصلہ ہم بچوں اور بلیوں پر نہیں چھوڑ سکتے۔

آپ کو یقین آئے یا نہ آئے مگر یہ واقعہ ہے کہ جب بھی میں نے کافی کے بارے میں استصوابِ رائے عامہ کیا اس کا انجام اسی قسم کا ہوا۔ شائقین میرے سوال کا جواب دینے کے بہ جائے اُلٹی جرح کرنے لگتے ہیں۔ اب میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کافی اور کلاسیکی موسیقی کے بارے میں استفسارِ رائے عامہ کرنا بڑی ناعاقبت اندیشی ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بدمذاقی ہے جیسے کسی نیک مرد کی آمدنی یا خوب صورت عورت کی عمر دریافت کرنا (اس کا مطلب یہ نہیں کہ نیک مرد کی آمدنی اور خوب صورت عورت کی عمر دریافت کرنا خطرے سے خالی ہے) زندگی میں صرف ایک شخص ملا جو واقعی کافی سے بے زار تھا۔ لیکن اس کی رائے اس لحاظ سے زیادہ قابلِ التفات نہیں کہ وہ ایک مشہور کافی ہاؤس کا مالک نکلا۔ ایک صاحب تو اپنی پسند کے جواز میں صرف یہ کہہ کر چپ ہو گئے کہ ''چھٹتی نہیں منہ سے یہ کافی لگی ہوئی'' میں نے وضاحت چاہی تو کہنے لگے: دراصل یہ عادت کی بات ہے۔

بعض احباب تو اس سوال سے چراغ پا ہو کر ذاتیات پر اتر آتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ جھوٹے الزام لگاتے ہیں۔ ایمان کی بات ہے کہ جھوٹے الزام کو سمجھ دار آدمی نہایت اعتماد سے ہنس کر ٹال دیتا ہے مگر سچے الزام سے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ اس ضمن میں جو متضاد باتیں سننا پڑتی ہیں، ان کی دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔ ایک کرم فرما، نے میری بے زاری کو محرومی پر محمول کرتے ہوئے فرمایا: ''ہائے کم بخت! تو نے پی ہی نہیں'' ان کی خدمت میں حلفیہ عرض کیا کہ دراصل بیسیوں گیلن پینے کے بعد ہی یہ سوال کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ دوسرے صاحب نے ذرا کھل کر پوچھا کہ کافی سے چڑ کی اصل وجہ معدے کے وہ داغ (Ulcers) تو نہیں جن کو میں دو سال سے لیے پھر رہا ہوں اور جو کافی کی تیزابیت سے جل اٹھتے ہیں اور اس کے بعد وہ مجھے نہایت تشخیص ناک نظروں سے گھورنے لگے۔ استصوابِ رائے عامہ کا حشر آپ دیکھ چکے۔ اب مجھے اپنے تاثرات پیش کرنے کی اجازت دیجیے۔ میرا ایمان ہے کہ قدرت کے کارخانے میں کوئی شے بے کار نہیں۔ انسان غور و فکر کی عادت ڈالے (یا محض عادت ہی ڈال لے) تو ہر بری چیز میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور نکل آتی ہے۔ مثال کے طور پر حقے ہی کو لیجیے۔ معتبر بزرگوں سے سنا ہے کہ حقہ پینے سے تفکرات پاس نہیں پھٹکتے۔ بلکہ میں تو یہ عرض کروں گا کہ اگر تمبا کو خراب ہو تو تفکرات

ہی پر کیا موقوف ہے، کوئی بھی پاس نہیں پھٹکتا۔ اب دیگر ملکی اشیائے خورد و نوش پر نظر ڈالیے۔ مرچیں کھانے کا ایک آسانی سے سمجھ آجانے والا فائدہ یہ ہے کہ ان سے ہمارے مشرقی کھانوں کا اصل رنگ اور مزہ دب جاتا ہے۔ خمیرہ گاؤ زبان اس لیے کھاتے ہیں کہ بغیر راشن کارڈ کے شکر حاصل کرنے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے۔ جوشاندہ اس لیے گوارا ہے کہ اس سے نہ صرف ایک ملکی صنعت کو فروغ ہوتا ہے بلکہ نفسِ امارہ کو مارنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ شلغم اس لیے زہر مار کرتے ہیں کہ ان میں وٹامن ہوتا ہے۔ لیکن جدید طبی ریسرچ نے ثابت کر دیا ہے کہ کافی میں سوائے کافی کے کچھ نہیں ہوتا۔ اہلِ ذوق کے نزدیک یہی اس کی خوبی ہے۔

معلوم نہیں کہ کافی کیوں، کب اور کس مردم آزار نے دریافت کی۔ لیکن یہ بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یونانیوں کو اس کا علم نہیں تھا۔ اگر انھیں ذرا بھی علم ہوتا تو چرائتہ کی طرح یہ بھی یونانی طب کا جزوِ اعظم ہوتی۔ اس قیاس کو اس امر سے مزید تقویت پہنچتی ہے کہ قصبوں میں کافی کی بڑھتی ہوئی کھپت کی غالباً ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عطائیوں نے "اللہ شافی اللہ کافی" کہہ کر موخر الذکر کا سفوف اپنے نسخوں میں لکھنا شروع کر دیا ہے۔

سنا ہے کہ چائے کے باغات بڑے خوب صورت ہوتے ہیں۔ یہ بات یوں بھی سچ معلوم ہوتی ہے کہ چائے اگر کھیتوں میں پیدا ہوتی تو ایشیائی ممالک میں اتنی افراط سے نہیں ملتی بلکہ غلّے کی طرح غیر ممالک سے درآمد کی جاتی۔ میری معلوماتِ عامہ محدود ہیں مگر قیاس یہی کہتا ہے کہ کافی بھی زمین ہی سے اگتی ہو گی۔ کیونکہ اس کا شمار ان نعمتوں میں نہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں پر آسمان سے براہِ راست نازل کرتا ہے۔ تاہم میری چشمِ تخیل کو کسی طور یہ باور نہیں آتا کہ کافی باغوں کی پیداوار ہو سکتی ہے اور اگر کسی ملک کے باغوں میں یہ چیز پیدا ہوتی ہے تو اللہ جانے وہاں کے جنگلوں میں کیا اُگتا ہو گا؟ ایسے اربابِ ذوق کی کمی نہیں جنھیں کافی اس وجہ سے عزیز ہے کہ یہ ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوتی۔ مجھ سے پوچھیے تو مجھے اپنا ملک اسی لیے اور بھی عزیز ہے کہ یہاں کافی پیدا نہیں ہوتی۔ میں مشروبات کا پارکھ نہیں ہوں۔ لہٰذا مشروب کے اچھے یا برے ہونے کا اندازہ ان اثرات سے لگاتا ہوں جو اسے پینے کے بعد رونما ہوتے ہیں۔

کافی ہاؤس کی شام کا کیا کہنا! فضا میں ہر طرف ذہنی کہرا چھایا ہوا ہے۔ جس کو سرمایہ دار طبقہ اور طلبہ سرخ سویرا سمجھ کر ڈرتے اور ڈراتے ہیں۔ شور و شغب کا یہ عالم کہ اپنی آواز تک نہیں سنائی دیتی اور بار بار دوسروں سے پوچھنا پڑتا ہے کہ میں نے کیا کہا۔ ہر میز پر تشنگانِ علم کافی پی رہے ہیں۔ اور غروبِ آفتاب سے غرارے تک، یا عوام اور آم کے خواص پر بقراطی لہجے میں بحث کر رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کافی اپنا رنگ دکھاتی ہے اور لوگ روٹھ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سوچ کر بیٹھ جاتے ہیں کہ: اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ گھر جائیں گے گھر میں بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے۔

کافی پی پی کر سماج کو کوسنے والے ایک انٹلکچوئیل نے مجھے بتایا کہ کافی سے دل کا کنول کھل جاتا ہے اور آدمی چہکنے لگتا ہے۔ میں بھی اس رائے سے متفق ہوں۔ کوئی معقول آدمی یہ سیال پی کر اپنا منہ نہیں بند رکھ سکتا۔ ان کا یہ دعویٰ بھی غلط نہیں معلوم ہوتا کہ کافی پینے سے بدن میں چستی آتی ہے۔ جبھی تو لوگ دوڑ دوڑ کر کافی ہاؤس جاتے ہیں اور گھنٹوں وہیں بیٹھے رہتے ہیں۔

بہت دیر تک وہ یہ سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ کافی نہایت مفرح ہے اور دماغ کو روشن کرتی ہے۔ اس کے ثبوت میں انھوں نے یہ مثال دی کہ: ابھی کل ہی کا واقعہ ہے۔ میں دفتر سے گھر بے حد نڈھال پہنچا۔ بیگم بڑی بد مزاج ہیں۔ فوراً کافی کا (TEA POT) لا کر سامنے رکھ دیا۔

میں ذرا چکرایا: پھر کیا ہوا؟ میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

میں نے دودھ دان سے کریم نکالی: انھوں نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا: شکر دان سے کیا نکلا؟

فرمایا: شکر نکلی، اور کیا ہاتھی گھوڑے نکلتے؟
مجھے غصہ تو بہت آیا مگر کافی کا سا گھونٹ پی کر رہ گیا۔

عمدہ کافی بنانا بھی کیمیا گری سے کم نہیں۔ یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ دونوں کے متعلق یہی سننے میں آیا ہے کہ بس ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ ہر ایک کافی ہاؤس اور خاندان کا ایک مخصوص نسخہ ہوتا ہے جو سینہ بہ سینہ، حلق بہ حلق منتقل ہوتا رہتا ہے۔ مشرقی افریقہ کے اس انگریز افسر کا نسخہ تو سبھی کو معلوم ہے جس کی مزے دار کافی کی سارے ضلعے میں دھوم تھی۔ ایک دن اس نے ایک نہایت پر تکلف دعوت کی جس میں اس کے حبشی خانساماں نے بہت ہی خوش ذائقہ کافی بنائی۔ انگریز نے بہ نظر حوصلہ افزائی اس کو معزز مہمانوں کے سامنے طلب کیا اور کافی بنانے کی ترکیب دریافت پوچھی۔ حبشی نے جواب دیا: بہت ہی سہل طریقہ ہے۔ میں بہت سا کھولتا ہوا پانی اور دودھ لیتا ہوں۔ پھر اس میں کافی ملا کر دم کرتا ہوں۔ لیکن اسے حل کیسے کرتے ہو؟ بہت مہین چھنی ہوتی ہے۔ حضور کے موزے میں چھانتا ہوں۔ کیا مطلب؟ کیا تم میرے قیمتی ریشمی موزے استعمال کرتے ہو؟ آقا نے غضب ناک ہو کر پوچھا۔ خانساماں سہم گیا: نہیں سرکار! میں آپ کے صاف موزے کبھی استعمال نہیں کرتا۔

سچ عرض کرتا ہوں کہ میں کافی کی تندی اور تلخی سے ذرا نہیں گھبراتا۔ بچپن ہی سے یونانی دواؤں کا عادی رہا ہوں اور قوتِ برداشت اتنی بڑھ گئی ہے کہ کڑوی سے کڑوی گولیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا! لیکن کڑواہٹ اور مٹھاس کی آمیزش سے جو معتدل قوام بنتا ہے وہ میری برداشت سے باہر ہے۔ میری انتہا پسند طبیعت اس میٹھے زہر کی تاب نہیں لا سکتی۔ لیکن وقت یہ آن پڑتی ہے کہ میں میزبان کے اصرار کو عداوت اور وہ میرے انکار کو تکلف پر محمول کرتے ہیں۔ لہٰذا جب وہ میرے کپ میں شکر ڈالتے وقت اخلاقاً پوچھتے ہیں: ایک چمچہ یا دو؟ تو مجبوراً یہی گزارش کرتا ہوں کہ میرے لیے شکر دان میں کافی کے دو چمچے ڈال دیجیے۔ صاف ہی کیوں نہ کہہ دوں کہ جہاں تک اشیائے خورد و نوش کا تعلق ہے، میں تہذیب حواس کا قائل نہیں۔ میں یہ فوری فیصلہ ذہن کے بجائے زبان پر چھوڑنا پسند کرتا ہوں۔ کھانے پینے کے معاملے میں میرا یہ نظریہ ہے کہ پہلا ہی لقمہ یا گھونٹ فیصلہ کن ہوتا ہے۔ بد ذائقہ کھانے کی عادت کو ذوق میں تبدیل کرنے کے لیے بڑا پتا مارنا پڑتا ہے۔ مگر میں اس سلسلے میں برسوں تلخی کام و دہن گوارا کرنے کا حامی نہیں، تاوقتیکہ اس میں بیوی کا اصرار یا گرہستی مجبوریاں شامل نہ ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مشرقی اور مغربی مشروبات کا موازنہ کرنے سے پہلے یہ بنیادی اصول ذہن نشین کر لینا ازبس ضروری ہے کہ ہمارے یہاں پینے کی چیزوں میں کھانے کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اپنے قدیم مشروبات مثلاً یخنی، ستو اور فالودے پر نظر ڈالیے تو یہ فرق واضح ہو جاتا ہے۔ ستو اور فالودے کو خالصتاً لغوی معنوں میں آپ نہ کھا سکتے ہیں اور نہ پی سکتے ہیں۔ بلکہ دنیا میں اگر کوئی ایسی شے ہے جسے آپ بامحاورہ اردو میں بیک وقت کھا اور پی سکتے ہیں تو یہی ستو اور فالودہ ہے جو ٹھوس غذا اور ٹھنڈے شربت کے درمیان ناقابل بیان سمجھوتا ہے، لیکن آج کل ان مشروبات کا استعمال خاص خاص تقریبوں میں ہی کیا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اب ہم نے عداوت نکالنے کا ایک اور مہذب طریقہ اختیار کیا ہے۔ آپ کے ذہن میں خدانخواستہ یہ شبہ نہ پیدا ہو گیا ہو کہ راقم السطور کافی کے مقابلے میں چائے کا طرف دار ہے تو مضمون ختم کرنے سے پہلے اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا ازبس ضروری سمجھتا ہوں۔ میں کافی سے اس لیے بے زار نہیں ہوں کہ مجھے چائے عزیز ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کافی کا جلا چائے بھی پھونک کر پیتا ہے۔

(چراغ تلے)

مشتاق احمد یوسفی (۱۹۲۳ء۔۲۰۱۸ء)

مشتاق احمد یوسفی کی ولادت ۴ ستمبر ۱۹۲۳ء کو متحدہ ہندوستان کے شہر ٹونک، راجستھان کے ایک تعلیم یافتہ خاندان میں ہوئی۔ آپ نے سینٹ جانس کالج آگرہ سے فلسفہ میں ایم۔اے اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ایل۔ایل۔بی کیا۔ بعد ازاں ہندوستانی پبلک سول سروسز کا امتحان پاس کر کے ۱۹۵۰ء تک ہندوستان میں مسلم کمرشیل بینک سے متعلق ہوئے اور ڈپٹی جنرل منیجر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس کے بعد بھارت سے ہجرت کر کے کراچی میں سکونت اختیار کی اور وہاں ایک بینک میں ملازمت اختیار کر لی۔
مشتاق احمد یوسفی نے اردو ادب میں مزاح نگاری کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا وہ اردو دنیا کے لیے ایک نایاب تحفے ہیں۔ ان کی پہلی کتاب "چراغ تلے" ۱۹۶۱ء میں چھپی جب کہ دوسری "خاکم بدہن" ۱۹۶۹ء، "زر گزشت" ۱۹۷۶ء، "آب گم" ۱۹۹۰ء اور آخری کتاب "شام شعر یاراں" ۲۰۱۴ء میں چھپی۔ ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے صدر پاکستان نے ۱۹۹۹ء میں "ستارہ امتیاز" اور ۲۰۰۲ء میں "ہلال امتیاز" سے نوازا۔ ۲۰ جون ۲۰۱۸ء کو وہ کراچی میں انتقال کر گئے۔

مشق

1۔ درج ذیل الفاظ میں سے درست جواب کا انتخاب کریں:

(i) یہ کہاں کی منطق ہے کہ جو چیز ـــــــ کو پسند ہو وہ حلق میں انڈیل لی جائے۔

الف: آنکھ　　ب: ناک　　ج: دل　　د: دماغ

(ii) یوپی کے شرفا رغبت سے کھاتے ہیں:

الف: روٹی اور سالن　　ب: رائتہ اور کھیر　　ج: چاول اور رائتہ　　د: کھیر اور رس ملائی

(iii) مصنف کے نزدیک کافی کے خوش ذائقہ ہونے کا تجربہ، پلا کر کیا جائے:

الف: کسی بچے کو　　ب: کسی بڑے کو　　ج: کسی جوان کو　　د: کسی بوڑھے کو

(iv) سمجھ دار آدمی نہایت اعتماد سے ہنس کر ٹال دیتا ہے:

الف: سچے الزام کو　　ب: جھوٹے الزام کو　　ج: بڑے الزام کو　　د: چھوٹے الزام کو

(v) آپ بامحاورہ اردو میں بیک وقت کھا اور پی سکتے ہیں:

الف: ستو اور فالودہ کو　　ب: چاول اور چائے کو　　ج: کافی اور شربت کو　　د: قلفی اور دودھ کو

۲۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کریں:

ا۔ مصنف کو کافی کیوں ناپسند تھی؟

ب۔ کافی کے بارے میں استصواب رائے سے کیا نتیجہ برآمد ہوتا تھا؟

ج۔ مصنف کافی کی تندی اور تلخی سے کیوں نہیں گھبراتا تھا؟

د۔ عمدہ کافی بنانا اور کیمیا گری کا آپس کا کیا تعلق ہے؟

ہ۔ مشرقی مشروبات، مغربی مشروبات سے کس طرح مختلف ہیں؟

۳۔ انٹرنیٹ کے ذریعے کسی بھی پاکستانی زبان کے حوالے سے ڈاکو منٹری سُنیں اور اس کا تجزیہ کرتے ہوئے اس پر اپنی رائے دیں۔

۴۔ طلبہ ذرائع ابلاغ کی مدد سے اردو ڈراما "الف۔نون" دیکھیں اور اس میں اُٹھائے گئے اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی نکات پر جماعت کے کمرے میں اپنی رائے دیں۔

۵۔ درج ذیل متن پڑھ کر خیالات، آرا اور رویوں کا آپس میں تعلق سمجھتے ہوئے اس پر تبصرہ اور تجزیہ کریں:

"سچ عرض کرتا ہوں کہ میں کافی کی تندی اور تلخی سے ذرا نہیں گھبراتا۔ بچپن ہی سے یونانی دواؤں کا عادی رہا ہوں اور قوتِ برداشت اتنی بڑھ گئی ہے کہ کڑوی سے کڑوی گولیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا! لیکن کڑواہٹ اور مٹھاس کی آمیزش سے جو معتدل قوام بنتا ہے وہ میری برداشت سے باہر ہے۔ میری انتہا پسند طبیعت اس میٹھے زہر کی تاب نہیں لاسکتی۔ لیکن وقت یہ آن پڑتی ہے کہ میں میزبان کے اصرار کو عداوت اور وہ میرے انکار کو تکلف پر محمول کرتے ہیں۔ لٰہذا جب وہ میرے کپ میں شکر ڈالتے وقت اخلاقاً پوچھتے ہیں: ایک چمچہ یا دو؟ تو مجبوراً یہی گزارش کرتا ہوں کہ میرے لیے شکر وان میں کافی کے دو چمچے ڈال دیجیے۔ صاف ہی کیوں نہ کہہ دوں کہ جہاں تک اشیائے خورد و نوش کا تعلق ہے، میں تہذیب حواس کا قائل نہیں۔ میں یہ فوری فیصلہ ذہن کے بہ جائے زبان پر چھوڑنا پسند کرتا ہوں۔ کھانے پینے کے معاملے میں میرا یہ نظریہ ہے کہ پہلا ہی لقمہ یا گھونٹ فیصلہ کن ہوتا ہے۔ بدذائقہ کھانے کی عادت کو ذوق میں تبدیل کرنے کے لیے بڑا پِتّا مارنا پڑتا ہے۔ مگر میں اس سلسلہ میں برسوں تلخی کام و دہن گوارا کرنے کا حامی نہیں، تاوقتیکہ اس میں بیوی کا اصرار یا گرہستی مجبوریاں شامل نہ ہوں۔"

۶۔ طلبہ جماعت کے کمرے میں اپنی استانی صاحبہ/استاد صاحب کی موجودگی میں مشتاق احمد یوسفی کے انشائیہ "کافی" کو پڑھتے ہوئے مصنف کے طرزِ تحریر پر مناسب انداز میں تبصرہ کریں۔

علاماتِ اوقاف (استعجابیہ، استفہامیہ، تفصیلیہ، رابطہ، ترچھا خط، علامت شعر، علامت تخلص، علامت مصرع)۔

(i) رابطہ: (:)

جملے یا عبارت میں وقفے سے زیادہ ٹھہراؤ کے لیے یہ علامت استعمال ہوتی ہے: مثلاً

میری بات یاد رکھنا: محنت ہی کامیابی کی کنجی ہے

کیا خوب سودا نقد ہے: اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

(ii) تفصیلیہ (:-)

جملے یا عبارت میں کسی بات کی تفصیل بتانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً

ورزش کے فائدے درج ذیل ہیں:

علامہ اقبال نے نصیحت کی تھی:-

(iii) سوالیہ یا استفہامیہ (؟)

جب کوئی بات پوچھنی یا کچھ دریافت کرنا مقصود ہو تو یہ علامت استعمال کی جاتی ہے۔ مثلاً

آپ کا نام کیا ہے؟ قائدِ اعظم کس شہر میں پیدا ہوئے؟

(iv) استعجابیہ (!)

حیرت یا حیرانی کے اظہار کے لیے یہ علامت استعمال کی جاتی ہے۔ مثلاً

ارے! اوہ!

(v) خطِ فاصل، ترچھا خط (/)

یہ علامت دفتری مراسلات کا حوالہ دینے کے لیے مختلف قسم کے بیانات، مسودات کے اندراجات میں متبادل اسما یا افعال کے درمیان لگائی جاتی ہے، مثلاً: مسمی/مسماۃ، بن/بنت، اقرار کرتا ہوں/کرتی ہوں وغیرہ وغیرہ

(vi) علامتِ مصرع، علامتِ شعر اور علامتِ تخلص:

شاعری لکھتے ہوئے جہاں کہیں ایک مصرع استعمال ہو وہاں علامت مصرع (ع)، جہاں پر شعر لکھا جائے وہاں علامت شعر (؎) اور جہاں شاعر اپنا شاعرانہ نام استعمال کرے اس کے اوپر علامت تخلص (ؔ) استعمال ہوتی ہے۔

سرگرمی

درج ذیل علاماتِ اوقاف کو پہچانیں اور ان کا اپنے جملوں میں مناسب استعمال کریں:

علاماتِ اوقاف	نام	علاماتِ اوقاف	نام
!		ؔ	
/		؛	
؟		ع	
۔:		،	
:			